International Research Journal of Religious Studies, Vol.:4, Issue: 02,July-Dec, 2024 PP: 1-12

OPEN ACCESS
IRJRS
ISSN (Online): 2959-1384
ISSN (Print): 2959-2569
www.irjrs.com

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں مناظرِ فطرت کی عکاسی

DEPICTION OF NATURAL SCENES IN MUSTANSAR HUSSAIN TARAR'S TRAVELOGUES

Dr. Qamar Abbas
Associate Professor, Department of Urdu, Govt. Graduate College, Bhakkar.
Email: itinformations@gmail.com

Dua Qamar
M.Phil Scholar, Department of Urdu, Qurtuba University , Dera Ismail Khan.
Email: duaqamarbkr@gmail.com

Abstract

Mustansar Hussain Tarar stands as a preeminent travelogue writer in Urdu literature, having transformed the genre of travel writing. His travelogues of Pakistan's northern regions exhibit a distinctive style, capturing the beauty of nature in a remarkable manner. Tarar's works vividly depict mountains, rivers, forests, waterfalls, snowfields, towering peaks, and lakes, showcasing their splendor. His journeys encompass regions such as Deosai, Ratti Gali, Chitral, Hunza, Shimshal, and Fairy Meadows, among others. These travelogues reveal countless hues of nature, presenting the enchanting landscapes of northern areas with exceptional charm. The integration of these breathtaking scenes in his travel narratives is unparalleled in Urdu literature. Furthermore, his travelogues serve as guidebooks for tourists, playing a significant role in promoting tourism in Pakistan.

***KeyWords**: Mustansar Hussain Tarar, Urdu Safarnama, Urdu Travelogue, Urdu Adab, Travelogue, Literature, Nature.*

موضوع کا تعارف:

مستنصر حسین تارڑ نے دنیا بھر کے ممالک کے سفر کیے اور بے شمار سفر نامے لکھے لیکن دیگر سفر نامہ نگاروں کے برعکس انہوں نے صرف بیرونی دنیا ہی کو اپنی سفر کی منزل نہیں ٹھہرایا۔ اپنے وطن کا حُسن بھی اُن کے لیے ایک خاص کشش رکھتا ہے اور اسی حُسن کی کشش انہیں بار بار شمالی علاقوں کی طرف لے جاتی ہے جہاں حُسنِ فطرت نے

اپنے تمام تر خزانے لٹا دیے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلے موجود ہیں۔ دنیا کی چودہ آٹھ ہزار فٹ بلند ترین چوٹیوں میں سے پانچ انہیں پہاڑوں میں موجود ہیں۔ دنیا کے عظیم ترین گلیشئرز یہیں چنگھاڑتے پھرتے ہیں۔ حسین ترین وادیوں کا یہ علاقے مرکز ہیں۔ صحت بخش پھلوں سے لدے باغات انہیں علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ حسین جھیلوں کے جھرمٹ انہیں پہاڑوں کے درمیان موجود ہیں۔ ہر طرف دریا شور مچاتے گزرتے ہیں۔ خوبصورت آبشاریں ایک الگ رنگ دکھاتی ہیں۔ چشمے ابلتے ہیں۔ قسم قسم کے پرندے اور جانور اِن پہاڑوں میں مسکن کیے ہوئے ہیں۔ شمالی علاقوں کے روپ میں فطرت نے پاکستان کو قدرتی حسن سے مالامال کر دیا ہے ا ور اسی حسن سے مستنصر حسین تارڑ کو عشق ہے۔ وہ یہاں کے بے شمار علاقوں میں گئے اور اپنے مشاہدات، تاثرات اور احساسات کو اپنے سفر ناموں کی صورت میں محفوظ کیا۔

مستنصر حسین تارڑ نے شمالی علاقوں کو دنیا کے سامنے متعارف کرایا ہے۔ اس سے پہلے شمالی علاقہ جات کے حسن کے بارے میں دنیا ناواقف تھی۔ بلکہ اکثر علاقوں کو تو اپنے ملک میں بھی نہیں جانا جاتا تھا۔ بہت سے مقامات ایسے ہیں جو انہیں کی دریافت ہیں اور آج کل معروف ترین سیر گاہوں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اس وقت جو شمالی علاقہ جات میں سیاحوں کا ہجوم نظر آتا ہے اور پاکستان میں سیاحت ایک باقاعدہ صنعت کی صورت اختیار کر چکی ہے، اس کے آغاز کا سہرا مستنصر حسین تارڑ کے سر ہے۔ آج بھی سیاح اُن کے سفر نامے پڑھ کر اِن علاقوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اکثر سیاحوں کے پاس اُن کے سفر نامے سفر کے دوران میں موجود ہوتے ہیں اور وہ اُن سے رہنمائی حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں کی مقامی آبادی بھی اُن کی احسان مند ہے کیونکہ اُن کے روزگار کا انحصار سیاحت پر ہے اور سیاحت کا یہ رجحان مستنصر حسین تارڑ کا پیدا کردہ ہے۔ بہت سے ہوٹلوں میں اب بھی کئی کمرے اُن کے نام سے منسوب ہیں اور اُن پر اُن کے نام کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے ہیں کہ ان دشوار گزار راستوں پر چلنا مشکل ہو گیا ہے لیکن یہ راستے اب بھی اُن کے منتظر نظر آتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو مستنصر حسین تارڑ کی حُسن شناس نگاہوں نے اُن کے حُسن کو پہچانا اور پھر اپنی آنکھوں سے دنیا بھر کو دکھا دیا۔ انہیں حسن کے بیان کا فن آتا ہے۔ اُن کے اسلوبِ بیان میں ایک ایسا جادو ہے کہ وہ ہر منظر کو مجسم کر دیتے ہیں اور قاری اُس منظر میں کھو جاتا ہے۔

"فیری میڈو مجھے پہچانتا تھا۔ اُس کی گھاس کا ہر تنکا میرے جوگرز کے بوجھ کو پہچانتا تھا۔ اس کے گدلے گھاس بھرے تالاب کے پانیوں کا ہر قطرہ مجھے کہتا تھا کہ تم نے کبھی ہم پر۔۔۔ کبھی سورج کے غروب میں اور کبھی اس کے ابھرنے کے سمے، کبھی ہم پر جھک کر نانگا پربت کی برفوں کو عکس ہوتے دیکھا تھا۔ سویر کی ٹھنڈک میں جب زرد کرنیں ٹھنڈک میں گھل کر آتی تھیں اور ڈوبتے سورج میں ٹھٹھرتی شام کو بھی تم مجھ پر جھکتے تھے۔ اُس کے جنگل سے بھی صدائیں آتی تھیں کہ تم کبھی میرے کنوارپن میں ملے تھے۔۔۔ میرے پہلے محبوب تھے۔"(1)

مستنصر حسین تارڑ کے اندازِ بیان میں ایک سحر انگیزی پائی جاتی ہے۔ وہ خوبصورت نثری اسلوب کے مالک ہیں۔ وہ مناظر کو بیان کرتے ہوئے ان میں پوری طرح کھو جاتے ہیں۔ اُن کے الفاظ میں اُن کے تاثرات اور احساسات گھلے ملے ہوتے ہیں۔ اُن کا کمال ہے کہ کوئی بھی منظر بیان کرتے ہوئے وہ ایک طلسماتی فضا قائم کر دیتے ہیں جو قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ اس طرح حسن کی عکس بندی کرتے ہیں کہ اُس کا ایک ایک پہلو مجسم ہو جاتا ہے۔ اُس کا جلوہ قاری کو مبہوت کر دیتا ہے۔ وہ منظر میں روح پھونک دیتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اُن کے ہاں حُسن کی دیویوں کا رُوپ دھار لیتی ہیں۔

"نانگا پربت۔۔۔ شل مکھی۔۔۔ سو چہروں والی برف پوش چوٹی۔ اس کے ہر چہرے پر سے گھنے بادل دھیرے دھیرے سرکتے جاتے تھے۔ وہ عیاں ہوتی جاتی تھی۔ اس کی سر دبر ہنگی کے آگے جو حجاب تھے وہ اُٹھتے جاتے تھے۔ وہ ایک ایسی زرد شہزادی تھی جس کے ریشم و اطلس کے لبادے اُترتے جاتے تھے اور اس کا گورا بدن اور سنہری اُبھار اور اس کا سرو قد ظاہر ہوتا جاتا تھا۔ وہ مکمل سپردگی کے انداز میں اپنے آپ کو کھولتی تھی۔ برہنہ ہو کر لیٹتی۔ وہ یوں گھنے بادلوں کی اوٹ میں سے ظاہر ہو کر فنتوری پر اُمڈ آتی تھی۔ کسی ایک جنم میں اس سے بڑھ کر خوش بختی نہ تھی۔"(2)

مستنصر حسین تارڑ کو سفر نامہ لکھنے کا فن آتا ہے۔ وہ اس فن کے ایک ایک پہلو سے واقف ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ کب کیا لکھنا ہے اور کیسا لکھنا ہے۔ وہ ایسے ایسے فنی حربے استعمال کرتے ہیں کہ قاری کے لیے سفر نامہ مکمل کیے بغیر درمیان میں چھوڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ان کا سب سے کارگر فنی ہتھیار حسن کا بیان ہے۔ وہ حسن کے بیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ کس جگہ، کس طرح، کس انداز میں حسن کو اُجاگر کرنا ہے۔ وہ اس کے لیے ماحول بناتے ہیں اور پھر حسن کی فضا پیدا کر کے جلوے بکھیر دیتے ہیں۔ وہ حسن کی تفصیلات تو بتاتے ہی ہیں لیکن اُن کا ایک فنی حربہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ابواب کے عنوان ہی ایسے رکھتے ہیں کہ جن سے حُسن ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اُن کے عنوانات بھی حسین ہوتے ہیں۔ مثلاً "برفیلی بلندیوں" کے چند ابواب کے عنوانات یہ ہیں: "فیری میڈو کے جنگل کے جھرنوں اور درختوں کی سِمفنی اور شام ہو رہی تھی"، "نلتر جھیلیں۔۔۔ شیشے کا ایک شہر۔۔۔ آبی جادوگری کے گل رنگ انار۔۔۔ ایک طلسم ہوش ربا"، "رنگوں کے فریب۔۔۔ نظر کے دھوکے۔۔۔ پانیوں نے مجھے بے ایمان کر دیا"، "ہمہ یاراں، ایسی بلندی۔۔۔ ایسی برفیں۔۔۔ اور ایسی چراگاہیں۔۔۔ لوئر شاہنی۔۔۔ سبحان اللہ"۔

مستنصر حسین تارڑ نے "برفیلی بلندیاں" کا سفر اپنے دوستوں کے ایک گروہ کے ساتھ کیا۔ یہ ایک مہماتی انداز کا سفر تھا۔ دشوار گزار راستوں سے گزر کر وہ فیری میڈوز تک پہنچے جہاں نانگا پربت کا نظارہ دیکھنے کو ملا۔ اُن کے اس سفر نامے کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مسلسل گپ شپ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے پر دلچسپ جملے کسے جاتے ہیں، ایک دوسرے پر غصے ہوا جاتا ہے اور چیختے چلاتے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ مل کر سفر کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں اور مل کر فطرت کی حسن کاریوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اُن کے مکالمے سفر

کے حسن کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ وہ مل کر خوفزدہ ہوتے ہیں، مل کر خوش ہوتے ہیں، مل کر تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور مل کر سکون کے لمحات اپنے اندر اتارتے ہیں۔ یہ چیز کسی بھی لمحے کی تاثیر کو ہزار چند کر دیتی ہے۔ ایک جگہ جب فیری میڈوز کے نظارے سے اُن کا ساتھی عمران مبہوت ہو کر رہ گیا، وہاں پر گفتگو کا انداز دیکھیں:

"ہائے اللہ جی"۔۔۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہونا ضروری نہ سمجھا اور براہِ راست آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ ہائے اللہ جی۔۔۔ میں اب کیا کروں۔۔۔ آپ نے مجھے یہ کیوں دکھایا۔۔۔ اور اب جا کر کیوں دکھایا، پہلے کیوں نہیں دکھایا۔۔۔ عمران اس اجڑی ہوئی فنتوری کو دیکھ کر حواس کھو بیٹھا تھا۔ میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات۔۔۔ یعنی اگر مری، نتھیا گلی اور کاغان میں، تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے۔۔۔ پھر وہ مجھ سے گلے گزاریاں کرنے لگا۔ "کیوں تارڑ صاحب آپ یہ مجھے کہاں لے آئے ہیں۔۔۔ سر جی آپ نے یہ کیا بنا دیا ہے؟"(3)

"چترال داستان" مستنصر حسین تارڑ کا گلگت، وادی گوپس، وادی پھنڈر، درہ شیندور، چترال اور کافرستان کا سفر نامہ ہے۔ اس سفر میں اُن کے بیوی بچے بھی موجود تھے۔ اس سفر نامے کے آغاز میں سفر نامہ نگار نے ایک ماحول بنایا ہے کہ حسین منظر اُسے یاد کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اس حوالے سے اپنے گزرے سفروں کو یاد کرتے ہیں، اُن برفوں کو یاد کرتے ہیں جو اب پگھل چکی ہوں گی، اُن کنکروں کو یاد کرتے ہیں جو ان کے بوٹوں تلے آئے تھے۔ یہ یادیں انہیں نئے سفر پر آمادہ کرتی ہیں۔ لیکن یہ حسن کی وادیوں کا سفر وہ تنہا نہیں کرتے۔ اُن کے پیارے بھی اُن کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ وہ اِن خوبصورتیوں کو صرف اپنی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنے پیاروں کی پیاری نگاہوں سے یہ منظر اُن کے لیے اور بھی پیارے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک خوف کا احساس بھی ان کے ہمراہ رہتا ہے کہ کہیں ان کے بچوں کو اِن پُر خطر راستوں پر کوئی گزند نہ پہنچے۔

"اس نیلے بورڈ کے ایک جانب عینی گردن ٹیڑھی کیے کھڑی تھی اور دوسری جانب میمونہ کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت میں کھلی تھیں۔۔۔ اور دونوں اس انتظار میں کہ میں شتابی سے ان کی تصویر اتاروں اور وہ پچھلی شب کی تیز ہواؤں کی وجہ سے درختوں سے جو سیب گرے تھے، انہیں اٹھا کر چکھیں کہ ان کا ذائقہ کیسا ہے۔۔۔ گوپس کی وادی کا ذائقہ کیسا ہے۔"(4)

قدرت کی یہ حسین وادیاں ایسا مقام ہیں جہاں وقت بھی رک جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ان وادیوں میں اس رکے ہوئے وقت کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ وقت اُن تاریخی آثار میں نظر آتا ہے جو وہاں جگہ جگہ موجود ہیں۔ وہاں کے پہاڑ خود ایک تاریخ ہیں جو صدیوں سے اپنی جگہ پر ساکت ہے۔ ان پہاڑوں کے اندر ایسے قلعے موجود ہیں جو ماضی کی داستانیں سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان قلعوں کی صورت میں قدیم تہذیب و ثقافت محفوظ ہو گئی ہے اور اِن کے جھروکوں سے ماضی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان پہاڑوں میں جگہ جگہ تاریخی آثار چھپے ہوئے ہیں۔ کہیں

چٹانوں پر نقش و نگار کی صورت میں، تو کہیں مجسموں اور تاریخی عمارتوں کی صورت میں۔ مستنصر حسین تارڑ اس رکے ہوئے وقت کو محسوس کرتے ہیں۔

"یہ پاکستانی شمال کی ایک دل کشی ہے کہ وہاں۔۔۔ کہیں الگ تھلک۔۔۔ ایسے مقام، ایسے گھر ہیں جہاں وقت، زمان و مکاں ایک سکوت میں آچکے ہیں۔۔۔ اس سکوت میں وقت رکا ہوا ہے۔۔۔ کہاں؟ وہاں، جہاں وقت کے گھڑیال کی سوئیوں نے پہلی حرکت کی تھی۔۔۔ سو برس پیشتر یا ہزار برس پہلے۔۔۔ یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے۔۔۔ لیکن وہ تو گنگ ہے، بتا نہیں سکتا، رکا ہوا ہے۔"(5)

شمالی علاقہ جات کا حسن واقعی جنت نظیر ہے۔ یہاں کی خوبصورتیاں بے مثال ہیں۔ اِن خوبصورتیوں میں بے شمار عناصر ہیں جو اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ ان میں سے ایک خوبصورت جزو یہاں کے پھلوں کے باغات ہیں۔ شمالی علاقہ جات کا موسم، آب و ہوا اور بلندیاں پھلوں کی افزائش کے لیے انتہائی موزوں ہیں جس کی وجہ سے یہاں انواع و اقسام کے پھل اگتے ہیں۔ خاص طور پر یہاں کے سیب، خوبانی، آڑو، آلوچے، چیری کے پھل دنیا بھر میں سپلائی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خشک میوہ جات کے گویا یہ علاقے گودام ہیں۔ اخروٹ، بادام، خشک خوبانی وغیرہ کی پیداوار یہاں پر مثالی ہے اور ملک بھر کی منڈیوں میں یہاں سے سپلائی ہوتے ہیں۔ یہ پھلوں کے باغات یہاں کے فطری حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے ان میں بے انتہا دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ان کو کھا کر لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ یہ باغات یہاں کے حسن میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ سرسبز درخت اور ان پر لگے ہوئے رنگ برنگے، رس بھرے پھل ایک الگ ہی نظارہ پیش کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے ان علاقوں کے حسن کے اس پہلو کو اپنے سفر ناموں میں بھرپور جگہ دی ہے۔

"اور ایک خاموش ٹھنڈک اتری ہوئی ہے جو درختوں تلے گہری ہوتی ہے۔۔۔ یہاں نظر دور تک نہیں جاتی۔۔۔ سیب، ناشپاتی، بادام، اخروٹ، خوبانی اور آلوچے کے گھنے درخت اسے روک لیتے ہیں۔۔۔ ان درختوں تلے پھلوں کے فرش بچھے ہیں اور ان کے رنگ سبز گھاس کی ٹھنڈک پر نکھرتے اور شوخ ہوتے ہیں۔۔۔ یہ زمان و مکاں کا الگ تھلگ سکوت۔۔۔"(6)

ایک مہم جو کی بھی عجیب نفسیات ہوتی ہے۔ وہ حسن کی تلاش میں طویل فاصلے طے کرتا ہے لیکن اُسے حسن بھی وہی پسند آتا ہے جہاں خطرات ہوں۔ وہ خوف کے سائے میں سفر کرتے ہوئے ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ پھر جب وہ اپنی منزل پر پہنچتا ہے تو حسن اور خوف کا ایک طلسماتی امتزاج اسے اپنی جکڑ میں لے لیتا ہے۔ یہی لمحے اس کی زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی بھی ایک بہت پیاری چیز ہے۔ خوف کے عالم میں یہ عہد کرتا ہے کہ پھر ایسی جگہ نہیں آؤں گا۔ لیکن کیا وہ حسن کے دیدار کے بغیر رہ سکتا ہے۔ جواب نہ میں ہے۔ اور پھر وہ انہیں پر خطر راستوں

پر چلتا ہوا ایسی ہی کسی اور خطرناک جگہ پر موجود ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں ایسے لمحات بارہا آتے ہیں جب وہ خوف زدہ ہو کر توبہ کرتے نظر آتے ہیں لیکن حسن کی کشش اُن کی توبہ کو بر قرار رہنے نہیں دیتی۔

"میں نے کچھ دیر پہلے جب خلطی جھیل کو اُن ریتلی اور پتھریلی بلندیوں سے جیپ کی ونڈ سکرین میں ایک معجزے کی طرح نمودار ہوتے دیکھا تو میں اُس پر ایمان لے آیا تھا۔۔۔ اُس آبی ایرانی قالین کے پیغمبری رنگوں کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔۔۔ لیکن اب اس کی جان لیوا خطرناکی مجھے بے ایمان کر رہی تھی۔۔۔ یہ جھیل ہر گز ایسی نہ تھی کہ میں اس کے کناروں پر دوبارہ سفر کرنے کی آرزو کرتا۔"(7)

ان کا کسی بھی منظر کو بیان کرنے کا انداز بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ وہ جب بھی کوئی سفر شروع کرنے لگتے ہیں تو اس کا جواز پیش کرتے ہیں۔ اس علاقے کا تعارف کراتے ہیں اور اس کے حسن، اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں اور آخر نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسے علاقے کو نہ دیکھنا اور وہاں نہ جانا ایک بہت بڑی غلطی شمار ہو گا۔ وہ سفر نامے کا آغاز ایک مخصوص قسم کے تاثراتی انداز میں کرتے ہیں جس کے اندر ایک رومانیت موجود ہوتی ہے۔ خوبصورت الفاظ کا چناؤ، فقروں کا دروبست اور پھر ایک خاص طرح کا ماحول پیدا کرنا اُن کی خوبی ہے۔

دیوسائی کا میدان دنیا کا بلند ترین میدان شمار ہوتا ہے۔ وہاں کی خوبصورتیاں ناقابلِ بیان ہیں۔ ہر طرف وسیع سبزہ زار، جھیلیں اور دریا موجود ہیں۔ جنگلی حیات کے لیے بھی یہ ایک بہت بڑی پناہ گاہ ہے۔ اپنے سفر نامے "دیوسائی" کا آغاز تعارفی انداز میں کرتے ہیں جس سے دیوسائی کا حسن ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

"میں دیوسائی کا بھورا ہمالیائی ریچھ ہوں اور میرا نام بگ بوائے ہے۔۔۔ میں دیوسائی کا ایک پھول ہوں اور جیسے میرے رنگ ان دیکھے ہیں، ایسے میرے نام ان گنت ہیں۔۔۔ میں دیوسائی کا وہ بادل ہوں جس کی شباہتیں طلسم ہیں۔۔۔ جھکتی ہیں تو اس میدان پر بچھ جاتی ہیں۔۔۔ اور میں خود دیوسائی ہوں، دنیا کا بلند ترین اور وسیع ترین خواب جس کے اوپر پہنچنے والوں کا سانس بلندی روکتی ہے۔"(8)

کوہ نوردوں کے جذبے ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کی آغوش میں جانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ کوئی بھی مشکل، کوئی بھی خوف اُن کے قدم روک نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ بلندیوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور وہاں پہنچنے کی آرزو اُن کے دل میں مچلتی رہتی ہے۔ پہاڑوں کے بھی اپنے اصول ہیں، اپنے قوانین ہیں۔ ان قوانین کے ہاتھوں سیاح ہمیشہ مجبور اور بے بس نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ رکاوٹیں راستہ روک کر کھڑی ہوتی ہیں۔ حوصلہ شکن مراحل پہاڑوں کے سفر کا حصہ ہوتے ہیں۔ منزل کے قریب پہنچ کر پلٹنا وہاں کا دستور ٹھہرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی علاقوں کا سفر کرنے کے لیے ایک طویل منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے۔ مالی طور پر بھی خاصہ بندوبست ہونا چاہیے۔ جسمانی توانائی چاہیے اور مضبوط ارادوں کی ضرورت ہے۔ لیکن قدرت کی رکاوٹیں ایسی حقیقت ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود سیاح کا جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوتا اور اس کے دل میں تڑپ موجود رہتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ دیوسائی کے حسین مناظر اُن تک پہنچنے کے درمیان رکاوٹیں اور اپنی نارسائی کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

" کبھی وہاں جولائی کے وسط تک برف نہیں پگھلتی تھی اور میں فیری میڈو چلا جاتا تھا۔ کبھی نانگا پربت کے روپل چہرے سے واپسی پر چلم چوکی سے اترتے نیلے پانیوں کے کنارے ان گھوڑوں کا ماتم کرتا تھا جو مجھے اس پار لے جانے کے لیے دستیاب نہیں ہوتے تھے اور کبھی اطلاع آتی تھی کہ بڑے پانی کا وہ پل جو ہر برس برف کے بوجھ سے مسمار ہو جاتا ہے ابھی تک دوبارہ نہیں بن سکا۔"(9)

آج شہروں سے رات کا حسن غائب ہو چکا ہے۔ مصنوعی روشنیوں نے آسمان کی روشنیوں کو ماند کر دیا ہے۔ آسمان بے رونق ہو چکا ہے۔ ستاروں کے جھرمٹ اور کہکشاں کی دودھیا روشنیاں غائب ہو چکی ہیں۔ برقی روشنیوں نے اور پھر شہروں کی آلودگی نے آسمان سے اُس کی خوبصورتی چھین لی ہے۔ لیکن جب ان شہری آلودگیوں سے دور سیاح پہاڑوں میں بسیرا کرتے ہیں تو یہ خوبصورتیاں لوٹ آتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی منظر دیوسائی میں بھی ہوتا ہے کیونکہ وہاں فطرت اپنی خالص حالت میں موجود ہے۔ مستنصر حسین تارڑ دیوسائی کی رات کے حسن کو ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ یہ رات جگمگا اٹھتی ہے۔ تاروں کی بہاریں جب دیوسائی کے میدانوں کی خوشبو کے ساتھ شامل ہوتی ہیں تو ایک نظر فریب نظارہ ہوتا ہے جس کو نہ صرف دیکھا جا سکتا ہے بلکہ محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی حسن کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفرنامے کے پردے کی سکرین پر منعکس کر دیا ہے۔ یہ حسن نہ صرف قاری کی آنکھوں میں سما جاتا ہے بلکہ مستنصر حسین تارڑ کی دلکش تحریر کے ذریعے اُس کے دل کے تاروں کو بھی چھوتا ہے۔

"اور اب زمانوں کے بعد۔۔۔ آج۔۔۔ دیوسائی کی رات میں وہ ستارے جل اُٹھے تھے، نظر آنے لگے تھے۔۔۔ آسمانی گنبد جھک کر میری پلکوں کو چھونے آرہا تھا۔۔۔ اتنا قریب تھا۔۔۔ ایک ایک ستارہ الگ تھا۔ اس کی حیثیت، اس کی نمائش جدا تھی۔۔۔ اور یہ سب ستارے۔۔۔ سارے کے سارے۔۔۔ دیوسائی کے آسمان کے، جو میرا گھیراؤ کرتے تھے، وہ صرف میرے آس پاس اور اوپر ہی پلکیں نہ جھپکتے تھے بلکہ دیوسائی کی گھاٹیوں اور اونچے نیچے ٹیلوں میں بکھرے ہوئے تھے۔"(10)

مستنصر حسین تارڑ کی دنیا ایک خوابوں کی دنیا ہے۔ وہ خود بھی خواب دیکھتے ہیں اور قاری کو بھی خواب دکھاتے ہیں۔ لیکن حیرت اُس وقت ہوتی ہے جب یہ خواب حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جب وہ سرسبز وشاداب وادیوں میں، برف زاروں کے تلے نیلگوں جھیلوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے یخ بستہ پانیوں میں سفید برف کے تودے تیرے پھرتے ہیں تو واقعی یہ دنیا خواب کی دنیا محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اتنی خوبصورتی، اتنا حسن، کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے کہ حقیقت میں بھی ہو سکتا ہے۔ رتی گلی جھیل آزاد کشمیر دنیا کی حسین ترین جھیلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مستنصر حسین

تارڑ نے دوبار یہاں کا سفر کیا۔ وہ اس کے حسن سے بے انتہا متاثر تھے۔ اپنے سفر نامے "رتی گلی" میں اس کی مسحور کن تصویر کھینچتے ہیں۔

"چٹانی آغوش میں جو ایک جھیل نظر آ رہی تھی، جس پر دھند چھائی تھی اور اس کے نیلگوں فریب کے پانیوں میں برف کے تودے تیرتے تھے اور ان میں سے ایک تودہ تو برف سے تراشا ہوا ایک راج ہنس دکھائی دیتا تھا اور جب وہ آہستگی اور سستی سے تیرتا چٹانوں میں سے جھیل کے پانیوں پر گرتی ایک آبشار کی دھار تلے آ جاتا تھا تو گرتے پانیوں کے زور سے ڈولتا ذرا دور نکل جاتا۔۔۔ ایسے منظر تو کسی آنکھ نے نہیں دیکھے۔۔۔ تو میں نے کیسے دیکھ لیے۔۔۔ نہیں دیکھے ناں۔۔۔ خود ہی گھڑ لیے۔"(11)

درہ شمشال گلگت بلتستان کا ایک دور دراز اور دشوار گزار علاقہ ہے۔ یہاں پر پہنچنے کے لیے ایک خطرناک جھولتے ہوئے پل کو کراس کرنا پڑتا ہے اور پھر ناقابلِ یقین حد تک خطرناک پگڈنڈی نما پہاڑوں پر معلق راستوں کے ذریعے جیپ پر یہ سفر طے کیا جاتا ہے۔ یہ سفر واقعی ایسا ہے کہ انسان خوف سے سانس تک لینا بھول جاتا ہے۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ کے لیے تو خوف کی منزل ہی سکون کی منزل ہے۔ وہ اس سنگلاخ چٹانی دنیا کا سفر کرتے ہوئے بھی اس سے لذت کشید کرتے جاتے ہیں۔ بلند و بالا پہاڑی چٹانیں انہیں خوف زدہ کرنے کی بجائے اُن کے لیے تفریح کا سامان میسر کرتی ہیں۔ وہ اُن کے رنگوں، اُن کی چمک، اُن کی اونچائی، اُن کی آن، اُن کی شان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُن کا سفر نامہ "شمشال بے مثال" مہماتی انداز کے بہترین سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس سفر نامے میں اس وادی کے حسن کی فراوانی کو انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

"۔۔۔ یہ گلابی رنگ نہایت آہستگی سے پیلی چٹانوں کے انبار میں سرایت کرتا ہوا نیچے آنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ دریائے شمشال کے دوسرے کنارے تک اتر گیا۔ اب صرف ہماری جیپ اور ہم سائے میں تھے اور آس پاس جہاں تک درے کی فصیلیں اٹھتی تھیں اور جہاں تک نظر جاتی تھی کرنوں نے چٹانوں میں جذب ہو کر انہیں گلابی رنگت سے بھر دیا تھا۔ جیسے یہ رنگ سورج کی پہلی کرنوں کی عطا نہ تھا بلکہ ان کے اندر موجود تھا اور اب آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس منظر میں ایک اور خاص سکون تھا جیسے یہ کائنات کی تخلیق کا پہلا دن ہو اور ابھی صرف بصارت اور حیرت عطا ہوئی ہو، کہ یہاں گویائی کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ درہ شمشال کا چٹانی گلاب کھل گیا تھا۔"(12)

مستنصر حسین تارڑ کا اسلوبِ بیان بہت خوبصورت ہے۔ وہ الفاظ کی ترتیب کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ان کو بات کرنا آتا ہے۔ وہ زبان و بیان کے فنی ذرائع کا استعمال بھی جانتے ہیں۔ خاص طور پر اُن کی تشبیہات و استعارات مثالی ہیں۔ جب وہ کسی چیز کی خوبصورتی کو واضح کرتے ہیں تو ایسی ایسی تشبیہات ڈھونڈ لاتے ہیں اور ایسے ایسے استعارات کا استعمال کرتے ہیں کہ اس چیز کے حسن کو مجسم کر دیتے ہیں۔ جھیل پر تیرتے برف کے تودوں کو انہوں نے سفید ہنسوں سے تشبیہ دے کر اُن کے حُسن کے نقش کو واضح کر دیا، شیر دریا سندھ کے پانیوں میں ابھرتی ہوئی ایک ڈولفن

کو انہوں نے ایک سنہری جزیرے سے تشبیہ دی ہے، جیپ کے چلنے کو بیر بہوٹی کی طرح رینگنے سے تشبیہ دی ہے۔ درہ شمشال کی ہر چٹان کو اجڑے ہوئے رومی محل کہا ہے یا کسی دیوی کے ویران معبد سے مثال دی ہے۔ انہوں نے خود کو ایک خلائی مسافر سے تشبیہ دی ہے جو ان عظیم پہاڑوں کی بلندیوں میں گویا تیر تا ہوا چلا جا رہا ہے۔ وہاں پر موجود کوہِ قارون کو انہوں نے تبت کے کوہِ کیلاش سے تشبیہ دی ہے۔ اُن کے سفر ناموں میں یہ تشبیہات کا سفر جاری رہتا ہے۔ وہ ایک کے بعد ایک تشبیہ کا استعمال کرتے جاتے ہیں، اپنی بات کو حسین بناتے جاتے ہیں۔ بات کا یہ حسن مناظرِ فطرت کے حسن کو آشکار کرتا جاتا ہے اور اس طرح وہ قاری کو اپنی تحریر کے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ یہی ان کا فن ہے۔

"اس سویر میں درہ شمشال پیپرا کے کھنڈروں سے کہیں بڑھ کر پُر طلسم اور نا قابلِ یقین تھا۔۔۔ اس کی پر ہیبت اور بڑی شان والی بلند چٹانیں گلابی ہو رہی تھیں، جیسے خالص پاسے کے سونے کے منجمد اہرام بلند ہو رہے ہوں۔۔۔ درہ شمشال اس سویر میں ایک گلابی رنگت کا تراشا ہوا بدن تھا جو پہلی شعاعوں سے زندہ ہو رہا تھا۔ ایک ایسا معجزہ تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھوں کی تخلیق ہوئی تھی اور میں اسے دیکھتا تھا اور اس پر ایمان لاتا تھا۔۔۔ کوہِ طور بھی کچھ ایسے منور ہوا ہو گا۔"(13)

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کی دنیا ایک نا قابلِ یقین دنیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی داستان کی کہانی پڑھ رہے ہوں جہاں پر طلسماتی ماحول ہو، ہر طرف سحر ہو، ایسا سحر جو انسانی عقل سے ماورا ہو، جس کو نہ کبھی کسی نے دیکھا ہو نہ سنا ہو۔ اور ایسی دنیا میں سفر نامہ نگار ایک مافوق الفطرت شخصیت کی طرح رواں دواں ہے۔ وہ سفر نامہ پڑھنے والوں کو بھی اسی فضا میں کھینچ لیتا ہے اور پھر سب سانس روکے اس جادو نگری کو دیکھتے، تجسس اور تحیر کے جذبات کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کا یہ انداز سفر نامے اور افسانے کا امتزاج پیدا کرتا ہے۔ اُن کے سفر نامے سفر کی معلومات فراہم نہیں کر رہے ہوتے بلکہ ایک کہانی بیان کر رہے ہوتے ہیں، ایک داستان سنا رہے ہوتے ہیں اور کہانی بھی ایسی جس میں رومانیت ہے، جس میں ایک سحر انگیزی ہے۔

"اور مشابرم کی مڑی ہوئی چونچ نما چوٹی پر تازہ برف کا دھندلا سفوف اڑتا تھا جیسے اس پر مسلسل دیوتاؤں کے رتھ اتر رہے ہوں اور اس کے دامن میں برفانی صورتوں، شکلوں اور مجسموں کی ایک فینٹسی تھی اور میں اس میں سے ایک بے یقین حیرت کے ساتھ گزرتا تھا، عجیب شکلیں تھیں، برف کے سفید ڈھیر جو مجسموں میں بدل چکے تھے۔ ہنری مور کا سوچ میں گم انسان۔ ایک میٹر اونچا ہاتھ جو آسمانوں کی جانب اشارہ کرتا تھا، ایک اداس ریچھ، سر جھکائے چادروں میں لپٹی عورتیں اور یہ سب کچھ برف کا اور سفید۔۔۔ اور نا قابلِ یقین۔"(14)

"کے ٹو کہانی" اُن برف زاروں کی کہانی ہے جہاں ایسی سردی ہے جو خون کو بھی منجمد کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ایسا خوف ہے جس سے خون ویسے ہی رگوں میں جم جاتا ہے۔ ہر طرف برف ہے۔ عظیم اور ہیبت ناک گلیشئرز کے

اوپر سیاحوں کو سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر کوئی عام سفر نہیں ہوتا، تجسس اور خوف کا سفر ہوتا ہے۔ ہر طرف گلیشیائی دراڑیں ہوتی ہیں۔ ذرا بھی پیر چُوکا اور انسان دراڑوں کے اندر گیا۔ وہاں سے بچ نکلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن اسی خوف کی فضا میں ہی سفر کرنا سیاحت اور مہم جوئی کا حسن ہے۔ فطرت کے ان ہیبت ناک مناظر کی اپنے سفر ناموں میں انہوں نے بہترین منظر کشی کی ہے۔ خاص طور پر ان کا سفر نامہ "کے ٹو کہانی" ان مناظر کے بیان سے بھرا پڑا ہے۔ ان مناظر کو بیان کر کے نہ صرف سفر نامہ نگار اپنے ذوق کی تشفی کرتا ہے بلکہ قارئین کے ذوق کی بھی آبیاری کرتا ہے جو خود تو خطرات میں نہیں جا سکتے لیکن خطرات کی کہانیاں اُن کو لطف دیتی ہیں۔ ایسے سفر میں جا بجا موت اور زندگی کی جنگ نظر آتی ہے۔ ان مناظر کی تصویر کشی اس انداز میں کی گئی ہے کہ موت کی سنسناہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔

"اور ہاں پچھلی شب پھر میرے بدن کو اس سرد موت کی قربت نے چھوا جو بالتورو گلشیئر کی ایک گہری دراڑ سے بے آواز آرہی تھی۔ کئی سو میٹر اندر جہاں صرف برف تھی اور لاکھوں برسوں سے تھی۔ وہاں کوئی تھا جو تاریکی میں بہتا تھا اور وہاں سے ہوا اوپر آتی تھی اور میں اس کو پھلانگتے ہوئے اس کی موت کی سردی سے کپکپاتا تھا۔"(15)

"نانگا پربت" مستنصر حسین تارڑ کا ایک خوبصورت سفر نامہ ہے جس میں فطرت کے حسن کی جھلک بہتات کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس قاتل پہاڑ کی داستان مشکلات سے پر ہے لیکن ان مشکلات میں اپنی صلاحیتوں کو آزمانا ہی ایک مہم جو سیاح کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ نانگا پربت کا راستہ بہت مشکل ہے۔ نانگا پربت وِیو پوائنٹ فیری میڈوز تک پہنچنے کے لیے پُر خطر پہاڑی راستوں پر جیپ کے ذریعے سفر کرنا پڑتا ہے۔ پھر پیدل ٹریکنگ کے ذریعے آگے بڑھتے ہیں۔ پتھریلے راستے کا سفر جہاں اکثر مقامات پر نہ سایہ ہوتا ہے نہ ٹھنڈا پانی، مسلسل چڑھائی اور دشوار گزار راستے انسان کے حوصلے پست کرنے کے لیے کافی ہیں۔ راستے میں گرم پانی کے چشمے اور دھوپ کی حدت، گرمی، سفر کی تھکاوٹ، یہ سب سیاح کو مارے دیتے ہیں۔ کافی طویل سفر ہے لیکن یہ سفر سیاح اس سہارے پر کرتے ہیں کہ جب وہ منزل پر پہنچیں گے تو ان کی تھکاوٹ دور کرنے کا سامان خوبصورت نظاروں کی صورت میں موجود ہو گا۔ اور یہی ہوتا ہے۔ منزل پر خوبصورت مناظر ان کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور تمام تھکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ جب یہ دشوار گزار راستے طے کر کے نانگا پربت وِیو پوائنٹ پر پہنچتے ہیں تو وہاں کا منظر حیران کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حسن کی فراوانی اُن کو سکتے میں ڈال دیتی ہے اور وہ اس کی تعریف میں محو ہو جاتے ہیں۔

"نانگا پربت کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ یہاں آپ کے سامنے آسمان کم تھا اور نانگا پربت کا برف پوش حجم زیادہ تھا۔ یہاں آسمان کم تھا اور سبزہ اور گلاب اور پانی کا شور اور تیز خنک ہوا زندگی سے لبریز اور نانگا پربت کی برفیں زیادہ تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت جب میں اس منظر کو حیرت سے دیکھتا تھا تو میرے چہرے پر بھی ایک عجیب سی خوشی تھی اور میں مسرت کے ان لمحوں میں تھا جب انسان مکمل طور پر نوزائیدہ ہو جاتا ہے۔"(16)

"ہنزہ داستان" میں مستنصر حسین تارڑ نے وادی ہنزہ کی خوبصورتیوں کو بیان کیا ہے۔ وہاں کی تاریخ پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور تاریخی مناظر کو مجسم کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں کی روایات کی خوبصورتی کو قلمبند کیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کا ذکر کیا ہے۔ ہنزہ کی خوبصورتیاں سفر نامے کا اہم ترین حصہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی راستے کی دشواریوں کا یہاں پر بھی ذکر ہے اور جابجا ایسے مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو خطرناک ہیں اور دل دہلا دینے کے لیے کافی ہیں۔

"ہنزہ روڈ ایک چھوٹا سا پہاڑی راستہ تھا جو دریا کے عین اوپر چٹانوں میں پچک کر چلتا تھا اور اُس پر مسافر چلتے نہیں تھے بلکہ چمٹ کر دھیرے دھیرے رینگتے تھے۔ ہنزہ تک کا یہ راستہ اتنا دشوار اور خوف ناک تھا کہ اس پر صرف مقامی لوگ ہی توازن برقرار رکھ کر چل سکتے تھے۔"(17)

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں مناظرِ فطرت کی جھلک ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ان مناظر میں رنگا رنگی ہے، تنوع ہے، کہیں برف پوش وادیاں ہیں تو کہیں وسیع سبزہ زار، کہیں بلند و بالا پہاڑ ہیں تو کہیں شور مچاتے دریا۔ قدرت کا ہر رنگ ان کے سفر ناموں میں نمایاں ہے۔ اپنے سفر نامے "یاک سرائے" میں وہ لکھتے ہیں:

"فیری میڈو کے جنگلوں میں، ٹاپ میدان میں، نانگا پربت کے فل وِیو کے سامنے، کوروفون کی ندیوں کے درمیان، اردوکس کی گھاس پر، کنکورڈیا کے برف زار کی ایک کلومیٹر گہری برف پر، دیوسائی کے پھولوں کی رفاقت میں۔۔۔ کیا کوہ نوردی کا یہ ایک سراسر مختلف زاویہ نہیں ہے۔"(18)

اور فطرت کے یہی سراسر مختلف زاویے ان کے سفر ناموں میں اپنی رونق دکھاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے فطرت کا بے بہا حسن اپنے سفر ناموں کے صفحات پر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ان کے یہی سفر نامے پڑھ کر دل بے تاب ہو جاتے ہیں اور فطرت کی ان خوبصورتیوں کو دیکھنے کے لیے شمال کا رُخ کرتے ہیں۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات (References)

1. مستنصر حسین تارڑ، چترال داستان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2002، ص 17۔
2. مستنصر حسین تارڑ، دیوسائی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2015، ص 7۔
3. مستنصر حسین تارڑ، رتی گلی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2017، ص 8۔
4. مستنصر حسین تارڑ، شمشال بے مثال، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2007، ص 12۔
5. مستنصر حسین تارڑ، کے ٹو کہانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997، ص 10۔
6. مستنصر حسین تارڑ، نانگا پربت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2001، ص 126۔

7. مستنصر حسین تارڑ، ہنزہ داستان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2018، ص 115۔
8. مستنصر حسین تارڑ، یاک سرائے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2018، ص 107۔
9. شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ، کراچی: منظر پبلیکیشنز، 1982۔
10. شہزاد منظر، اندھیری رات کا تنہا مسافر، کراچی: منظر پبلیکیشنز، 1984۔
11. علی حیدر ملک و صبا اکرام، شہزاد منظر فن اور شخصیت، کراچی: فکشن گروپ پبلیکیشنز، 1996۔
12. قمر رئیس، ڈاکٹر، تلاش و توازن، دہلی: ایوب یوسفی، 1968۔
13. محمد یٰسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 2002۔
14. وضاحت حسین رضوی، ڈاکٹر، اردو ناول: ہیئت، اسالیب، اور رجحانات، لکھنؤ: وضاحت حسین رضوی، 2014۔
15. گوپی چند نارنگ، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور اردو ادب، دہلی: مکتبہ جامعہ، 1997۔
16. شوکت صدیقی، ڈاکٹر، اردو ناول کا ارتقا، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، 1988۔
17. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو (جلد 3-4)، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2000۔
18. سید وقار عظیم، اردو ناول، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1960۔
19. وزیر آغا، ڈاکٹر، افسانہ اور جدید افسانہ، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، 1982۔
20. کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، علی گڑھ: ادارۂ فروغ اردو، 1975۔
21. حمید احمد خان، اردو کے ترقی پسند افسانے، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، 1989۔
22. قرۃ العین حیدر، ادب اور ہم، دہلی: اردو اکیڈمی، 1994۔
23. انتظار حسین، ادب اور نئی کہانی، لاہور: فیصل پبلی کیشنز، 1990۔
24. ابوالکلام قاسمی، مابعد جدیدیت: مفہوم و متن، دہلی: مکتبہ جامعہ، 2001۔
25. ممتاز شیریں، افسانہ: تنقیدی مطالعہ، کراچی: کتاب گھر، 1983۔
26. فتح محمد ملک، پاکستانی ادب کی نظریاتی اساس، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 1998۔